برطانوی پنجاب: جدید مؤرخین کی نظر میں

ثمینہ اعوان

کسی بھی قوم یا معاشرہ کے لیے اس کے ماضی کی صحیح تشکیل بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے تمام طبقات اپنے ماضی کو اپنے اپنے نظریات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور پھر اسی ساختہ ماضی کے ذریعے سے معاشرہ پر اپنا تسلط قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان کے ماضی کا المیہ یہ ہے کہ یہاں کی تاریخ اصل میں حکمرانوں کے عہد کی تاریخ ہے جنہوں نے یہ تاریخ اپنے ہی نقطہ نظر سے مرتب کی اور عوام کی تاریخ کو یا تو فراموش کر دیا گیا یا حقائق کو بیرونی مورخین کے حوالے سے لکھا گیا۔ برطانوی پنجاب کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو کچھ یہی معاملہ نظر آتا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں الحاق پنجاب کے بعد سے اس کی سیاسی، سماجی اور معاشی تاریخ پر سید محمد لطیف کی کتاب **تاریخ پنجاب** (انگریزی، مطبوعہ ۱۸۸۹ء) ایک اہم اور مستند کتاب مانی جاتی ہے جو آج سو سال گزر جانے کے بعد بھی تاریخی مواد کے نقطہ نظر سے اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جبکہ وقت کے ساتھ کئی اور کتابیں اب تک منظر عام پر آ جانی چاہیے تھیں۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ہاں تاریخ ایک جگہ ٹھہر گئی ہے؟ کیا نئے افکار و تحقیق کی کمی نے تاریخی تحقیق کو خصوصاً پنجاب میں پنپنے نہیں دیا؟ کیا سامراجی نظام میں راج اور اس کے معاون طبقے ہی اعلیٰ کردار اور تعریف کے حامل رہے اور مزاحمتی تحریکوں کو بغاوت اور عدم تعاون کے کھاتے میں ڈھال کر نظرانداز کر دیا گیا؟ یہ اور اس جیسے کئی سوالات ایسے ہیں جو برطانوی پنجاب پر جدید مورخین کی لکھی کتابوں کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا کہ فاتحین نے مفتوحہ علاقوں کے فتح سے پہلے کے دور کو ظلم و ستم اور اندھیر نگری سے تعبیر کیا اور اپنے عہد کو عہد زریں قرار دیا حالانکہ تحقیق کا تقاضا یہ تھا کہ مقامی مورخین تقسیم کے بعد انگریزی راج کے تحت پنجاب کے معاشرے پر راج کے اثرات کا جائزہ لیتے کہ کیا واقعی انگریز کی فتح سے پہلے پنجاب کا معاشرہ انتشار و افراتفری کا شکار تھا؟ کیا واقعی راج نے اسے سیاسی استحکام بخشنے کے علاوہ معاشرتی انصاف کے اصولوں سے مزین کیا؟

برطانوی پنجاب پر گذشتہ دس برسوں میں شائع ہونے والی تمام کتابوں کا مطمع نظر وہی ہے جو غیر ملکی مورخین (خصوصاً برطانوی) نے نوآبادیاتی دور کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھا۔ اس میں پنجاب کی سیاسی ترقی اور معاشی خوشحالی کی وجہ یہی بیان کی جاتی رہی کہ یہاں انگریزی راج کو وفاداروں کا ایک ایسا طبقہ میسر رہا

جنہوں نے انگریزی حکومت کے ساتھ معاشی، سیاسی اور سماجی اشتراک کے اصول پر عمل کیا۔ بقیہ صوبوں کے برعکس پنجاب ایک ایسا صوبہ تھا جہاں انگریزی حکومت کی بنیاد تعاون کرنے والے طبقہ کی بدولت مضبوط تھی ۔ یہ طبقہ ان زمینداروں اور جاگیرداروں کا تھا جنہوں نے انگریزی حکومت سے وفاداری کا اظہار کر کے اپنی جائیدادیں اور مراعات محفوظ کی تھیں۔ انہوں نے ہی اپنے مزارعین کو بھی اس وفاداری میں شریک کر لیا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ وفاداری اس طرح سے تھی کہ مزارعین زمیندار کے وفادار اور زمیندار راج کا وفادار، اس وفاداری کے عوض راج نے زمینداروں کا تحفظ کیا اور انہوں نے اس کے بدلے میں راج کی خدمت کی[1]۔

ڈاکٹر آئن ٹالبوٹ برطانوی پنجاب کی تاریخ، تقسیم ۱۹۴۷ء اور یونینسٹ پارٹی کی سیاست پر ایک جدید مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ آخری وزیر اعظم کے برطانوی متحدہ پنجاب، خضر ٹوانہ کے سوانح نگار بھی ہیں۔ جدید پاکستانی مورخین جو پنجاب کی معاشی یا سیاسی تاریخ پر تحقیق میں مصروف ہیں زیادہ تر ڈاکٹر ٹالبوٹ کے مندرجہ بالا فارمولہ سے متفق ہیں اور کم وبیش، اسی نہج پر اپنی تحقیق کا دائرہ کار بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان مورخین کی مثالیں اور شواہد زیادہ تر مقامی حوالوں پر مشتمل ہیں مگر نظریاتی طور پر وہ اسی زاویہ فکر کے پابند نظر آتے ہیں۔ اس مضمون میں ان تمام کتابوں کو پاکستانی تشخص اور نظریاتی بنیادوں پر پرکھنے کی کاوش کی گئی ہے کیونکہ حالیہ برسوں میں مغرب اور اسلام کے تعلقات پر جو بحث چل نکلی ہے اس میں مسلمانوں کو اپنے کردار اور تشخص کے مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اپنی تاریخی بنیادوں کو ٹھوس حقائق کی روشنی میں استوار کرنا ہوگا تاکہ ہماری آئندہ نسلیں یہ جان سکیں کہ پاکستانیت کے استحکام کے لئے اپنی تاریخ کو جاننا کس قدر ضروری ہے۔ پاکستان میں اس سے پہلے تاریخ سے دوری کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ تاریخ عوامی نقطہ نظر کی بجائے حکومتی انداز لیے ہوئے تھی اسی لیے عوامی بنیادوں پر قائم تاریخ کی تصنیف جدید مورخین کے لئے وقت کی طرف سے ایک اہم چیلنج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ زاہد چوہدری کی کتاب جو حسن جعفر زیدی نے مرتب کی اس میں **مسلم پنجاب کے سیاسی ارتقاء جلد ۵** سے ہم باری باری ان کتابوں کے مواد اور طرز تحقیق کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ کتاب **پاکستان کی سیاسی تاریخ** کے عنوان سے ایک سیریز کی شکل میں شائع ہوئی اس کا حالیہ ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں چھپا۔ یہ پنجاب کے سیاسی نشیب وفراز، معاشرتی تقسیم، ہندو مسلم سکھ تضاد پر تاریخ کے طلباء کے لئے ایک اہم تحقیقی مواد کی حیثیت رکھتی ہے[2]۔

یہ جلد تاریخی مواد کے لحاظ سے اگرچہ شخصی سیاست، گروہی مفادات اور مسلم پنجاب پر ایک اہم دستاویزی ماخذ ہے مگر اس میں کوئی نیا نظریاتی فارمولہ مرتب نہیں کیا گیا بلکہ ہندو مسلم لیڈروں کے درمیان سیاسی اختلافات اور پاکستان بننے کے بعد پنجابی سیاسی لیڈروں کی موقع پرستی جیسے عنوانات پر لکھی گئی واقعات کے تسلسل

کی کہانی ہے۔ اگر چہ اس میں لالہ لاجپت رائے، سر فضل حسین، درمیانے طبقے کے مسلمانوں کی مزاحمتی تحریکوں اور پنجابی پریس پر بھی قلم آزمائی کی گئی مگر راج اور نو آبادیاتی نظام کی پنجاب میں اس قدر موثر حکومت کے نفاذ کی وجوہات پر کوئی نظریہ پیش نہیں کیا گیا اور صفحہ نمبر ۲۳ پر "انگریزوں کی قائم کردہ حکومت فوجی حکومت تھی" کے نظریہ کو درست مان کر تھور برن (انگریز کمشنر) کی رپورٹ کا ترجمہ لکھ کر موضوع پر بحث سمیٹ لی گئی۔ اس طرح انگریز کے ساہوکارانہ نظام اور جاگیرداریت کے مابین غیر قدرتی اشتراک یا اتحاد کا گہرائی کے ساتھ تنقیدی جائزہ پیش نہیں کیا گیا جو قیام پاکستان کے بعد تک پنجابی سیاست پر اثر انداز رہا۔ اگر چہ عاشق حسین بٹالوی کی کتاب '**اقبال کے آخری دو سال**' اور مذکورہ کتاب میں مقامی سیاست اور سیاسی لیڈروں کے مابین نظریاتی اختلافات کے ساتھ ساتھ غیر مسلم سیاست پر بھی کما حقہ روشنی ڈالی گئی مگر نو آبادیاتی نظام حکومت اور مسلم سیاست کے درمیان جو ضرورت کا رشتہ قائم کیا گیا مقامی مآخذوں کی روشنی میں اس کا سیر حاصل تجزیہ ہنوز تشنہ کام ہے[۳]۔

پنجاب اور یہاں کے باسیوں کی تاریخ، جغرافیہ، زرعی ڈھانچہ، فوج، فرقہ واریت، یونینسٹ پارٹی کی سیاست، زوال، جنگ عظیم اول اور دوم، مسلم لیگ کی آئینی فتح اور برطانوی راج کے خاتمے کے بعد تقسیم تک اہم تاریخی واقعات پر مبنی کتاب **پنجاب اور راج** ڈاکٹر آئن ٹالبوٹ کی تصنیف ہے جو ۱۹۸۸ء میں پہلی دفعہ بھارت سے شائع ہوئی۔ اس کتاب نے برطانوی پنجاب کی تاریخ پر ایک مربوط اور اہم تحقیقی مواد فراہم کیا۔ بعد میں ۲۰۰۰ء تک شائع ہونے والی بیشتر کتابوں کا انداز اور نظریاتی فارمولا ٹالبوٹ کے مقالے پر منحصر ہے اس کتاب کا اردو ترجمہ طاہر کامران نے کیا اور **پنجاب غلامی سے آزادی تک ۱۸۵۷ء۔۱۹۴۷ء** کے نام سے ادارہ 'تخلیقات' کی جانب سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی جو مقامی مورخین اور طلباء کی بڑی تعداد کو اپنے مواد اور مرکزی خیال سے متاثر کرنے میں کامیاب رہی یہ ایک غیر ملکی مورخ کی پنجاب کی تاریخ پر ایک جامع تحقیقی کاوش تھی۔ تقسیم کے بعد ذاتی ڈائریوں اور سوانح عمریوں کے علاوہ یادداشتوں پر مبنی کتابوں کا جو سلسلہ چلا، اس میں سر فضل حسین کی سوانح، جو اُن کے بیٹے نے لکھی اور سر فیروز خان نون جو اس زمیندار طبقے کا ایک نمائندہ تھے جنہوں نے انگریزی راج سے اشتراک کے اصول پر عمل کیا تھا اور پنجاب یونینسٹ پارٹی کے ممبر رہے، نے لکھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس طرز فکر کی تصدیق ہوتی ہے جو تقسیم سے قبل کے پنجاب اور یہاں کے حکمرانوں کا طرز فکر تھا۔

> ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۹ء تک پنجاب میں لیفٹیننٹ گورنر کی عملداری تھی جن کی مدد کے لئے درجن بھر افراد کی ایک چھوٹی سی مشاورتی کونسل تھی۔ یہ کونسل ملک کے انتہائی وفادار اور خوشحال طبقوں کے معمر لوگوں پر مشتمل تھی۔ جنہوں نے سلطنت برطانیہ کی سیاسی و انتظامی خدمات

سرانجام دی تھیں اور جن کی کوئی سیاسی وابستگی نہ تھی۔ ان کا انتخاب اس لئے نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ کوئی خوش گفتار مقرر ہوتے تھے یا انہوں نے یونیورسٹی کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہوتی تھیں بلکہ ان کے انتخاب یا نامزدگی کا تمام تر معیار یہ تھا کہ وہ عقل سلیم کے مالک ہوتے تھے اور وہ اسے ملک کے مسائل و معاملات میں استعمال کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بڑے خوشحال اور باحیثیت ہوتے تھے اور جو لوگ انگریز حکام تک رسائی کے خواہشمند ہوتے تھے یہ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ یہ معززین یونیورسٹی کے گریجویٹ نوجوانوں کو بطور سیکرٹری ملازم رکھ لیتے تھے جن کے فرائض میں اپنے آقاؤں کی تقریریں لکھنا بھی ہوتی تھیں۔ کونسل کے ان معزز ارکان کو جب ایجنڈے کے کسی خاص مسئلے پر تقریر کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ اپنے سیکرٹری کی لکھی ہوئی تقریر سنا دیتے تھے۔ لاہور میں میرے ایک رشتہ دار رکن سر عمر حیات ٹوانہ نے جو اپنی تقریر لانا بھول گئے تھے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے رکن رائے بہادر رام سرن داس کی تقریر کا مسودہ اٹھایا اور اسے فرفر سنا دیا۔ رام سرن داس بہت سٹپٹائے لیکن تحمل سے کام لیا اور جب ان کی باری آئی تو انہوں نے کہا کہ مجھے اپنی دوست کی رائے سے کامل اتفاق ہے جنہوں نے ابھی ابھی تقریر ختم کی ہے کونسل کے تمام ارکان آپس میں گہرے دوست تھے۔ اور مکمل ہم آہنگی سے کام کرتے تھے۔ یہ دراصل حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا مشترکہ جذبہ تھا جنہوں نے انہیں مسخر کر رکھا تھا اور ایک غیر ملکی حکمران کی خدمت گزاری میں کبھی ذلت محسوس نہیں ہوئی تھی[۴]۔

پنجاب میں برادری کا نظام بہت مضبوط تھا اور ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں یہ نظام اور بھی شدت اختیار کر جاتا ہے۔ دور حاضر میں تعلیم نے اگرچہ اس نظام میں کچھ ہلچل پیدا کی ہے لیکن اب بھی برادری کی پنچائیت بہت مضبوط ہے۔ برادری کی یہ پنچائیت وراثت اور دیگر خانگی جھگڑوں کو نمٹاتی ہے، انضباطی کارروائی بھی کرتی ہے اور سزا کے طور پر کسی ممبر کا حقہ پانی بند کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔ برادری کے کسی رکن میں اس کے خلاف بغاوت نہیں ہوتی۔ یہ پنچائیت انگریزوں کے دور میں برادری اور حکومت کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن گئی۔ مختلف سطحوں پر کونسلوں میں برادریوں کی نمائندگی نے برادریوں کے مابین رقابت پیدا کی۔ یہ رقابت اکثر اوقات ذاتی اور بعض اوقات سیاسی ہوتی تھی۔ غریب کسان اور بے زمین مزارعین چونکہ معاشی طور پر بڑے زمینداروں

کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے یہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ان جاگیرداروں کے ادنیٰ کام کرتے تھے اور ان کی حیثیت کمیوں سے زیادہ نہ تھی یوں ان جاگیرداروں نے پنچائیت کے متوازی جھگڑے نمٹانے کے لئے ایک نظام قائم کرلیا تھا۔

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مضبوط جاٹ برادری تھی جبکہ مغربی پنجاب میں جاگیردار اور پیر یا سجادہ نشین چھائے ہوئے تھے۔ پیروں کا دیہی آبادی پر گہرا اثر ورسوخ تھا۔ انگریز ان پیروں کے ذریعے بھی اپنی عملداری کو دیہی سماج تک لے جانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ اس کے عوض انہیں حکومتی سرپرستی حاصل ہوئی انہیں عزت اور جاگیروں سے نوازا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خانقاہیں بڑی بڑی جاگیروں میں تبدیل ہوگئیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں بابا فرید گنج شکر (پاک پتن شریف) جو کہ پنجاب کے صف اول کے صوفی ہیں، کے سجادہ نشینوں کے پاس پچیس ہزار ایکٹرز مین تھی۔ تیرہویں صدی کے ہمعصر مزاروں میں شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی سہروردیہ سلسلہ کے پاس ملتان میں پانچ ہزار ایکٹرز مین تھی۔ جھنگ میں شاہ جیونہ کے سجادہ نشین دس ہزار ایکٹر اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں کے سجادہ نشین ۷ ہزار ایکٹرز مین کے مالک تھے[5]۔ ۱۹۸۸ء میں ڈیوڈ گل مارٹن نے **ایمپائر اینڈ اسلام** میں انہی پیروں، خانقاہوں کے متولیوں اور متحدہ پنجاب کی آئینی سیاست کے پیچ وخم پر بحث کی[6]۔ اس سے پہلے وہ اس موضوع پر مختلف مقالہ جات کے مصنف رہ چکے ہیں۔ متحدہ پنجاب میں انگریز نے جس غیر قدرتی اشتراک کی بنیاد ڈالی تھی، اس کا ایک فریق صوفی پیر اور خانقاہوں کے متولی صاحبان بھی رہے ہیں۔ اگرچہ انگریزوں کے ساتھ ان کا یہ الحاق بہت گہرا نہیں تھا مگر برادری، پیری مریدی اور جاگیردار و مزارعین کے درمیان سرپرستی کا رشتہ وہ فعال سیاسی قوتیں تھیں جن پہ انگریز کی نوآبادیاتی حکومت کا مضبوط ڈھانچہ استوار تھا۔

مقامی مورخین نے پنجاب کی تاریخ لکھتے ہوئے پیری مریدی کے ان سلسلوں کی اہمیت اور طریقہ کار کو فراموش رکھا۔ مستند پاکستانی مورخ، کے کے عزیز کے علاوہ ان پر تحریک پاکستان کے حوالے سے علیحدہ کوئی تحقیقی کام سامنے نہیں آسکا اور ہمیں ایک غیر ملکی مورخ کی تحقیق پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

پنجاب ریسرچ گروپ (PRG, UK) نے ۱۹۹۴ء میں پنجاب اسٹڈیز کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ PRG نے عالمی پنجابی کانفرنسوں کے انعقاد اور ان میں پیش کئے جانے والے مقالات کی اشاعت کا بھی بندوبست کیا جس کے نتیجے میں ۲۰۰۱ء تک دو جلدیں منظر عام پر آئیں۔ ان دونوں کے بنیادی خیال پنجابی کی ثقافتی شناخت، پنجاب اور تقسیم ۱۹۴۷ء اور پنجاب اور گلوبلائیزیشن تھے (۷) ان مورخین نے متحدہ پنجاب کی مختصر

تاریخ کے علاوہ، علاقائی تحریکوں اور جدید سیاسی وثقافتی رجحانات کو درجہ دوم کی سیاست کے تحت اپنا موضوع سخن بنایا۔ ۱۹۸۴ء بعد مشرقی پنجاب کو بالعموم اور پنجابی آبادکاری اور گلوبلائزیشن کو بالخصوص 'پنجابی مہاجرت' کے عنوان کے تحت تحقیق کا موضوع بنایا اس طرح ۱۹۹۰ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک پنجاب کی نوآبادیاتی تاریخ اور تقسیم کے موضوعات کے تجزیے پر زور رہا۔

ہم ان تاریخ دانوں کے زمرے میں عمران علی کو اول حیثیت دینے پر مجبور ہیں۔ ان کی کتاب **پنجاب انڈر امپریلزم ۱۹۸۸ء** میں شائع ہوئی[8] اور اس میں ۱۹۸۵ء سے ۱۹۴۷ء تک متحدہ پنجاب کی زرعی معیشت اور اس پر راج کے اثرات پر بحث کی گئی۔ پنجاب کی تاریخ کی نئی جہت پر تحقیق کرنے والوں میں عمران علی سرفہرست ہیں اگرچہ انہوں نے بھی پنجاب کے کئی دیگر ترقی پسند مورخین کی طرح آخری وزیراعظم پنجاب خضر ٹوانہ کو کم اہم شخصیت سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ یونینسٹ پارٹی کو جاگیرداروں اور نوآبادیاتی حکومت کی ملی بھگت سمجھ کر شہری متوسط اور غریب طبقہ اور دیہی امیروں، وڈیروں اور جاگیرداروں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ اس نظریہ تاریخ کے مطابق خضر ٹوانہ ایک ایسے طبقے کی وفاداری کا نمونہ ہے جسے انگریز نے مراعات اور خطابات سے نواز کر اپنے لئے حاصل کیا اس لئے وہ خضر کو پنجاب کے دیگر مراعات یافتہ جاگیرداروں کے ساتھ شامل کرتا ہے جو انگریزوں کی متعارف کردہ زرعی ترقی کے نتیجے میں مستفید ہوئے۔ اس کی رائے میں پاکستان میں قومیت کا فقدان، کمزور سول سوسائٹی اور تنزل اسی پالیسی کا نتیجہ تھے۔

عمران علی بھی ٹالبوٹ کے نظریے پر اپنی تحقیق کو آگے بڑھاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ تقسیم کے بعد پنجاب میں انگریزوں کی اس سیاسی اور معاشی منصوبہ بندی کو قومی تحریک اور سرمایہ دارانہ انقلاب کی موت کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور نوآبادیاتی حکومت کے درمیان یہ ''اشتراک'' اس لئے اور بھی متحرک ہوا جب پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں پنجاب نے اپنے آپ کو انگریزوں کا ''دست شمشیر'' ثابت کیا۔ اس کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ دیہی اشراف کے طبقہ نے ۱۸۵۷ء میں بھی انگریزوں کی مدد کی تھی۔ ہنری لارنس کا طبقہ فکر اسی لیے انگریزوں کا حلقہ نیابت ان زمینداروں کو قرار دیتا ہے جو پنجاب کے دیہی باشندے ہیں اور ان میں سکھ جاگیردار بھی شامل ہیں۔ نون، حیات اور ٹوانہ ان خاندانوں میں شامل ہیں جنہوں نے انگریزوں کے مشکل وقت میں ساتھ دیا۔ بعد میں انہیں انگریزوں نے حکومت میں حصہ دار بنا کر اس وفاداری کا معاوضہ دیا[9]۔

مندرجہ بالا تمام حقائق کی روشنی میں اگر پنجاب کی نوآبادیاتی دور کی تاریخ لکھی جائے گی تو تمام مواد اس زمیندار نواز انگریز پالیسی کی تصدیق کرتا ہے جو اس نے پنجاب کے متوسط شہری طبقے کے استحصال کے لئے

جان بوجھ کر اختیار کی اور یہاں پر شہری و دیہی بنیادوں پر لوگوں کی تقسیم عمل میں آئی ۔اس کے لئے مائیکل اوڈوائر کا سب سے موثر سب سے اہم سب سے نتیجہ خیز اور سب سے زبردست حربہ جو انگریزی راج میں ایجاد ہوا ایک قانون تھا جسے عرف عام میں قانون انتقال اراضی کہا جاتا ہے ۔اس قانون کی رو سے پنجاب کے ہر ضلع کی آبادی زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھی ۔"سر مائیکل اوڈوائر پہلا شخص تھا جس نے حد درجہ ہوشیاری اور چالاکی سے پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کو شہری مسلمانوں کا حریف بنا کر اس صوبے میں مسلمانوں کی قومی وحدت کو سخت نقصان پہنچایا"[۱۰]۔

پنجاب میں اس قانون کے نفاذ کے بعد شہری اور دیہاتی طبقوں میں ہر قسم کا بُعد پیدا ہوا۔دیہاتی سمجھتے تھے کہ صوبوں کے ٹیکس میں شہریوں کی ادائیگی کی نسبت کم تھی لیکن وہ زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔شہری مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ایک طرف تو وہ قانون انتقال اراضی کی پابندیوں کی وجہ سے زمینداری نہیں کر سکتے دوسری طرف صنعت و حرفت' تجارت و کاروبار پر ہندو ساہوکاروں اور بنیوں کا قبضہ تھا۔اس لیے لے دے کر ان کی معاش کا دارو مدار اب سرکاری ملازمتوں پر رہ گیا ہے اب ملازمتوں کے بٹوارے میں بھی دیہی و شہری کوٹے کی تقسیم نے زراعت و غیر زراعت پیشہ زمیندار و غیر زمیندار کا سوال اٹھا کر ان کے لئے روزگار کے مواقع محدود کیے جا رہے تھے ۔مندرجہ بالا نکات سے ثابت یہ ہوا کہ ۱۸۵۰ء کے بعد ہنری لارنس نے مغلوں کے متعارف کردہ دیرینہ نظام اراضی میں جو بنیادی تبدیلیاں کی تھیں ان سے مسلمان کاشت کار قرضے اور معاشی ذلت کی کھائی میں جا گرا۔ساہو کار کو قانونی تحفظ کی فراہمی کے بعد مسلمانوں کی مجموعی طاقت میں کمی ہوئی اور ہندو ساہوکاروں کی ایسی متوسط کلاس سامنے آئی جو انگریزوں کی سیاسی معیشت کے میدان میں حریف ثابت ہوئی ۔ان کے صنعت و حرفت اور کاروبار تھے ۔بمبئی مدراس اور کلکتہ میں یہی لوگ خالص سرمایہ کاری کے عمل سے تعلق رکھتے تھے ۔پنجاب میں ۱۸۵۰ء کے بعد ۱۹۰۰ء کے انتقال اراضی ایکٹ تک پنجاب کی معیشت پر ان ہندو ساہوکاروں کا قبضہ رہا۔اس انتقال اراضی ایکٹ کے نفاذ سے پنجاب میں دو بڑی تبدیلیاں ہوئیں:

(1) انگریزوں اور جاگیرداروں کا الحاق عمل میں آیا

(2) فرقہ وارانہ عدم آہنگی نے اپنے پنجے جمائے

ابھی تک اس انتقال اراضی ایکٹ کے برطانوی پنجاب کی سیاست پر اثرات ، کے موضوع پر ہمیں کوئی تحقیقی مقالہ نظر نہیں آتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگریز نے اپنے راج میں جاگیرداروں (مسلمان + سکھ) کو اپنا حلقہ

نیابت کیوں بنایا۔ اس کے دو بڑے مقاصد تھے۔ اول یہ کہ کینال کالونیوں کا وسیع جال پھیلا کر جنگ عظیم کے دوران بہترین کیولری اور انگریزی فوج کے لئے مضبوط اور تنومند فوجیوں کی فراہمی' دوم انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون پر کم پڑھے لکھے مگر قابل اعتبار جاگیردار طبقے کی بھرپور نیابت، جو برادری و قبیلے کے مضبوط نظام کی بدولت انگریز کے استحصالی نظام حکومت کو استحکام بخشنے کا اہم وسیلہ بنے۔ برطانوی حکومت پر اس کامیابی کا انکشاف کہ اس نے زمینداروں کی حمایت حاصل کر لی، پہلی عالمی جنگ (۱۸۔۱۹۱۴ء) کے ناگفتہ بہ حالات کے دوران ہوا جب زمینداروں نے نہ صرف انڈین فوج میں بھرتی میں مدد کی بلکہ انہوں نے غدر تحریک' تحریک خلافت اور سانحۂ جلیانوالہ باغ کے بعد ہونے والے فسادات کو بھی کم کرنے میں مدد کی۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات نے برطانوی استعمار اور زمینداروں کے مابین ہم آہنگی اور روابط میں مزید اضافہ کیا ان اصلاحات کے تحت صوبائی خودمختاری کو وسعت دی گئی۔ رائے دہندگی کی شرائط کو نرم کر کے رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ دیہی اور شہری انتخابی حلقوں کی تقسیم کو صوبے میں قانونی حیثیت دی گئی۔ جداگانہ طریقہ انتخاب اور زمینداروں کی مخصوص نشستوں کی وجہ سے ایک طرف تو جاگیرداری نظام کی راہ ہموار ہوئی اور دوسری طرف فرقہ درانہ جھگڑے دیہی علاقوں میں پہنچ گئے ۔اسی ماحول میں میاں فضل حسین اور چوہدری چھوٹو رام نے پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی[۱۱]۔

ڈاکٹر آئین ٹالبوٹ نے اپنی پنجاب پر تصنیف کردہ کئی کتابوں میں یہی فارمولا پیش کیا کہ انگریزوں نے کس طرح پنجاب میں سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل ایک عظیم بہادر اور وفادار فوج کی تشکیل کی۔ اس نے کینال کالونیز کے قیام کے ذریعے اور نوآبادیاتی اصلاحات کے نفاذ کے ذریعے اس علاقے کی معیشت اور معاشرت پر دوررس اثرات مرتب کیے جو تحریک پاکستان کی جدوجہد' تقسیم اور تقسیم کے بعد پاکستان کی سیاست پر ابھی تک نظر آتے ہیں اور جس کی بنیاد شہری و دیہی طبقے کی وہی روایتی سیاسی کشمکش اور تناؤ ہے جس نے سامراجی نظام کو قوت بخشی اور فرقہ ورانہ رجحانات کے عمل کو تیز کیا۔ ان حالات میں پنجاب میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام اور قیام پاکستان تک پراثر سیاست کا سہرا پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی کے سربراہ جو سر فضل حسین اور ان کے ہندو جاٹوں اور مسلمان جاگیردار لیڈروں کے اتحاد کا نتیجہ تھا۔ یہ جماعت ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک پنجاب کی سیاست پر کلی طور پر چھائی رہی اور اس نے 'جاگیردارانہ نظام' کے ذریعے صوبے کی متوسط' شہری اور دیہی آبادی کو منظم کیا۔ بعض اوقات اس نظام اور انگریزی حکومت میں ٹکراؤ کی نوبت بھی آ گئی۔

۱۹۰۱ء میں قانون انتقال اراضی کے نفاذ اور ۱۹۰۷ء میں کسانوں میں بے چینی پھیلنے سے پنجاب کی سیاست میں لالہ لاجپت رائے' سر محمد شفیع اور سر فضل حسین جیسے سیاستدانوں کے عہد زریں کا دروازہ کھل گیا۔ اس

عرصے کو احتجاجی سیاست کا ایک نیا دور بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ سر فضل حسین ۱۹۰۴ء میں سیاست کے میدان میں داخل ہوئے اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے ممبر رہے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے صوبے کی سیاست پر توجہ مرکوز کرنا شروع کی۔ ان کے خیال میں پنجاب پہلی جنگ عظیم کے دروازے پر انتظامی لحاظ سے ایک کمزور صوبے کی حیثیت میں داخل ہوا۔ جس کی اپنی ایگزیکٹو کونسل اور ہائی کورٹ نہ ہونے کے علاوہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں اس کی نمائندگی نہ صرف کمزور تھی بلکہ نا اہل بھی تھی۔ صوبے کی کمزور سیاسی حیثیت کا جائزہ لیتے ہوئے سر فضل حسین نے پنجاب نیشنل یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ سر فضل حسین کی صوبے میں اہم ترین سیاسی شخصیت ہونے کی حقیقت بھی مسلمہ تھی۔ ۱۹۳۶ء تک وہ اتنے طاقتور رہے کہ جناح کو چیلنج کرنے سے بھی نہیں گھبرائے۔ انہوں نے صوبائی لیڈر ہونے کے باوجود ایگزیکٹو کونسل میں صوبائی خودمختاری کو زیادہ سے زیادہ تحفظ دینے کی اَن تھک کوشش کی[12]۔

فضل حسین کی سیاست کے دوران پنجاب میں متوسط شہری طبقے کی بہت ساری تحریکیں پروان چڑھیں جن میں سے دو مجلس احرار اور خاکسار تحریک سرِ فہرست ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے بانی امیر افضل حق اور عنایت اللہ مشرقی پڑھے لکھے بارو زگار شہری تھے۔ دونوں ملازمتیں چھوڑ کر نسبتاً جذباتی احتجاجی تحریکوں سے وابستہ ہوئے اور مذہب کے نام پر مختلف تحریکوں کے ذریعے عوام کو متحرک کیا مگر واضح پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے یونینسٹ پارٹی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ دونوں جماعتیں مسلم لیگ اور کانگریس سے مایوس ہو کر ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب اور مسولینی اور ہٹلر کے فاشزم سے متاثر نوجوانوں کی تحریکیں تھیں جن میں جذبہ حب الوطنی بھی تھا اور اپنی غلامی کا احساس بھی۔ جدید پنجاب کی تاریخ پر سوائے ان جماعتوں کے ممبران کے پاکستانی مورخین نے لکھنے سے پہلو تہی کی۔ خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی کی زندگی پر اسلم ملک کی ۲۰۰۰ء میں شائع ہونے والی کتاب کے علاوہ مجلس احرار، اتحادِ ملّت یا نیلی پوش تحریکوں پر ہمیں جانباز مرزا، مظہر علی اظہر اور شورش کاشمیری کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر مصنف دکھائی نہیں دیتے۔

تحریکِ پاکستان میں پنجاب کے سیاسی کردار پر ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر اعظم چوہدری کی کتاب **تحریک پاکستان میں پنجاب کا کردار** شائع ہوئی جس میں مقابلتاً نئے مواد کی روشنی میں تاریخی واقعات کو از سرِ نو بیان کیا گیا۔ اس میں اگرچہ مقامی تاریخ کے حوالے بیان کئے گئے مگر اس کا بنیادی مرکزی خیال پنجاب کا سیاسی ماحول تھا اور اس کے سماجی ڈھانچے، معیشت، انگریزوں اور یونینسٹ پارٹی کے اشتراک اور پنجاب کی مختلف قوموں کے سماجی روابط پر بہت کم مواد تحریر میں لایا گیا۔ اس طرح برطانوی تسلط سے صوبائی خودمختاری تک بحث تو کی گئی ہے مگر یہ

صوبائی خود مختاری کس نوعیت کی تھی اور انگریز کے کیا مفادات تھے جو پورے ہوئے ان پر کوئی نیا نقطہ نظر پیش نہیں کیا گیا۔ تاریخی مآخذوں کی روشنی میں یہ ایک بیانیہ تاریخ کہلائی جاسکتی ہے اور جس میں غیر ملکی مورخین کے نقطہ نظر کو چیلنج کرنے کی بجائے ان پر انحصار کرنے کی روش اپنائی گئی۔ ۱۹۹۷ء میں زرینہ سلامت کی کتاب **پنجاب ان ٹوئیٹیز** شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مسلمانوں کا کیس معاشرتی' سیاسی' معاشی اور مذہبی بنیادوں اور تاریخی واقعات کی روشنی میں پرکھا گیا اور یوں پنجاب کی تاریخ میں پہلی دفعہ سماجی اور معاشی موضوعات پر مختصر مگر سیر حاصل بحث ہوئی۔ باوجودیکہ اس میں بھی بنیادی مآخذ انگلستان کی لائبریریوں سے درآمد شدہ ہیں مگر تجزیہ اور تحقیق کی کسوٹی پر حقائق کو جانچا گیا ہے اور پنجاب میں مزاحمتی، سماجی اور مذہبی تحریکوں پر تحقیق کو آگے بڑھانے کے لئے ایک مختصر مگر نئے فارمولا پر مبنی ایک تحقیقی کاوش ہے[۱۳] اس میں عوامی تاریخ پر کام کیا گیا مگر عوامی مآخذوں کی بجائے سرکاری مواد پر انحصار کیا گیا ہے۔

یونینسٹ پارٹی کی سیاست اور عہد پر ایک یا دو ابواب کے علاوہ ابھی تک مقامی مورخین کی کوئی تحقیقی کاوش سامنے نہیں آئی۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ فضل حسین سے لے کر خضر حیات ٹوانہ تک یادداشتوں کے علاوہ صرف ایک کتاب اب تک شائع ہوئی حالانکہ مسلم سیاست اور متحدہ پنجاب میں قیادت کے حوالے سے دیگر شخصیتیں بھی کافی اہم ہیں۔ قومی تاریخی کمیشن کی شائع کردہ سر سکندر حیات خان کی سیاسی سوانح جو ڈاکٹر افتخار حیدر ملک نے ۱۹۸۵ء میں لکھی، کے علاوہ بقیہ شخصیات ابھی تک مقامی مورخین کی تحقیق اور توجہ کی منتظر ہیں[۱۴]۔

حالیہ برسوں میں غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں میں یونس صمد نے **پاکستان یا پنجابستان** کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ حمزہ علوی اکبر ایس احمد' افتخار حیدر ملک، اکرام علی ملک اور عمران علی ایسے مورخین ہیں جو اکثر و بیشتر پنجاب کے سیاسی، ثقافتی اور سماجی موضوعات پر مقالہ جات تحریر کرتے رہے ہیں جو بین الاقوامی کانفرنسوں اور جرائد کی زینت بنتے ہیں۔

پنجاب کی غیر روایتی انداز میں لکھی جانے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب **انڈس ساگا** اعتزاز احسن کی تصنیف ہے[۱۵] اس کتاب میں زمانہ قدیم سے لے کر موجودہ وقتوں تک پنجاب کی سیاسی، سماجی، زمانی اور معاشی ادوار کی تاریخ مختلف النوع مآخذوں کی مدد سے لکھی گئی ہے۔ ایسی کتابیں جدید دور میں تاریخ کے طلباء کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے ان گنت سوالوں کے جواب مہیا کرتی ہیں اور سوچ اور فکر کی نئی جہتوں کو فروغ دیتی ہیں۔ اس کتاب میں پنجاب کی تاریخ پر ایک نیا نظریہ پیش کیا گیا ہے جس کی بنیاد عوامی سوچ اور ماخذوں پر رکھی گئی ہے اور مصنف کے موثر طرز فکر اور عمدہ تخیل کی منفرد مثال ہے۔ ڈاکٹر ڈشکا ایچ سید کی کتاب **ویمن آف برٹش**

پنجاب: پردے سے سیاست تک خواتین کی سیاسی جدوجہد میں شمولیت اور رجحانات پر ایک علمی کاوش ہے[16] جسے تحقیق کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر پنجاب کی نوآبادیاتی تاریخ میں عورتوں کے کردار پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ عائشہ جلال کی کتاب **سیلف اینڈ سورنٹی** جزوی طور پر پنجاب کے اندر مکمل آئینی و غیر آئینی جدوجہد، سیاسی کشمکش اور دھڑے بندیاں اور مسلم لیگ کی جدوجہد پاکستان کو اقبال کے فلسفہ خودی کی کسوٹی پر پرکھتی نظر آتی ہے۔ یہ عمومی طور پر برصغیر کے مسلمانوں کی عوامی تاریخ کی فلسفیانہ توجیہہ فراہم کرتی ہے[17]۔

برطانوی پنجاب کے دیہی علاقوں کی تاریخی حیثیت' فرقہ وارانہ عدم آہنگی' نوآبادیاتی استحصالی نظام کے تحت متوسط اور تیسرے درجے کے عوامی طبقے کی ایسی تحریکوں کے سراغ بھی ملتے ہیں جو انگریزی سامراجی نظام' حاکموں اور مقامی جاگیرداروں کے خلاف چلائی گئیں۔ درجہ دوم کی سیاست کے تحت لکھی گئی ایسی کتابیں **مولانا گل شیر شہید**[18] اور **آزادی کی انقلابی تحریک**[19] کے عنوانات سے نوجوان محمد عمر فاروق نے قلمبند کیں ان میں تحریک خلافت' تحریکِ احرار' مسلم بازار اور اصلاح المسلمین کی قومی و مقامی تحریکوں کے تاریخی شواہد اس امر کے غماز ہیں کہ پاکستان کی جدوجہد میں عوام اور اس کے دلی جذبات پوری طرح سے کارفرما تھے۔ ان میں پہلی کتاب سوانح عمری ہے جب کہ دوسری کتاب پنجاب میں دوسری جنگ عظیم کے دوران' فوجی بھرتی بائیکاٹ پر ایک تحقیقی کاوش ہے۔

اختتامیہ

پنجاب پر گذشتہ دس سال کے دوران لکھی جانے والی کتابوں میں مقامی مصنفین نے اپنی بنیادی توجہ مسلم لیگ اور مرکزی جماعتوں، قائداعظم اور اقبال کے فلسفہء پاکستان کی توضیع پر ہی رکھی جبکہ پاکستان سے باہر پنجاب پر لکھی جانے والی کتابیں مرکزی سیاست سے نکل کر 'درجہ دوم کی سیاست' کے تحت مشرقی و مغربی پنجاب' تقسیم اور تقسیم کے بعد معاشی و سماجی ڈھانچے' بین الاقوامی پنجابی نوآبادکاری اور گلوبلائزیشن پر مرکوز رہی۔ حیرت انگیز طور پر فضل حسین جو متحدہ برطانوی پنجاب کے اہم سیاسی لیڈر اور صوبائی خودمختاری کے سب سے بڑے علمبردار رہے ان پر کوئی کتاب اس عرصے کے دوران سامنے نہیں آئی۔ سوائے ان کے خطوط اور ڈائریوں کے جنہیں پروفیسر وحید احمد نے مرتب کیا۔ انکی ایک ہی سوانح عمری ان کے بیٹے عظیم حسین نے ۱۹۴۶ء میں شائع کی یہ پنجاب اور یونینسٹ پارٹی کی سیاست کے ساتھ ایک علمی زیادتی یا لاپرواہی کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر اعظم چوہدری کی کتاب میں اگرچہ ایک باب یونینسٹ پارٹی کی سیاست پر لکھا گیا مگر دیگر اہم لیڈروں مثلاً لالہ لاجپت رائے اور آریہ سماج کے بارے میں جو ہم عصر پنجابی سیاسی لیڈر اور مسلم مخالف انتہا

پسند جماعت کے لیڈر رہے۔ اور ۱۹۲۴ء میں اخبارات میں مضامین کے ایک سلسلے کے ذریعے' تقسیم' کو ہندو مسلم مسئلے کا حل قرار دے چکے تھے، کے بارے میں سوالات تشنہ کام رہ گئے ہیں۔ پاکستانی مصنفین میں زرینہ سلامت کا کام پنجاب پر ایک اہم تحقیقی کاوش شمار ہوتی ہے انہوں نے پنجاب کے حالات پر ۱۹۲۰ء کے عشرے میں اہم بنیادی مآخذوں کی روشنی میں پرکھا اور وہاں کی مسلم آبادی کو معاشی' سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے اہم قوم قرار دیا یہ واحد کتاب ہے جو مسلمانوں کے سماجی نظام' حالات اور روایت پر بھی روشنی ڈالتی ہے ورنہ اس سے پہلے ڈبلیو سی اسمتھ کی کتاب **ماڈرن اسلام اِن انڈیا** متعلقہ موضوع پر مستند تصنیف مانی جاتی تھی۔ زرینہ سلامت نے پنجاب میں' پنجابی سیاسی روایت' کے پنپنے میں دیہی وشہری تقسیم کی برطانوی پالیسی پر توجہ مرکوز کرنے یا اس کا تجزیہ کرنے کے بجائے اہم سیاسی وسماجی تبدیلیوں' واقعات' آئینی سیاست اور اصلاحات کی وضاحت پر زیادہ توجہ صرف کی۔ یہ پنجابی مسلمانوں کی سماجی' تعلیمی اور سیاسی جدوجہد' حیثیت اور کردار پر ایک جامع اور مستند اضافہ ہے اس کے تمام مآخذ اہم اور بنیادی نوعیت کے ہیں۔ ایک بات جو پنجاب پر ریسرچ کرنے والوں میں اب تک مشترک ہے کہ وہ مسلم لیگ کی مرکزی سیاست کو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے ساتھ اس طرح مربوط کرتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کی سیاست' لیڈر اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی پالیسی پس پردہ چلی جاتی ہے اور قاری یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں صوبائی الیکشن میں صرف دو نشستیں جیتنے والی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں آخر کیسے ساری جماعتوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

ان سوالوں کے جوابات ہمیں پروفیسر آئن ٹالبوٹ کی کتابوں **خضر حیات اور فریڈم کرائی** سے ملتے ہیں۔ ڈیوڈ گلمارٹن کی کتاب ایمپائر اینڈ اسلام بھی پنجاب کے ۱۹۴۶ء کے انتخابات اور مسلم لیگ کی آئینی سیاست کے انداز سمجھنے کے لئے اہم ذریعہ ہے۔ عمران علی کی کتاب **پنجاب انڈر امپریلزم** پنجاب کی معیشت پر کینال کالونیز کے قیام اور انگریز نوآبادیاتی حکومت کی جنگ عظیم کے دوران پنجاب کی ترقی کے لئے انقلابی اصلاحات پر ایک پرمغز تحقیق ہے۔ اس میں ہمیں پنجاب پر ایک نیا نظریہ اُبھرتا نظر آتا ہے اور 'دیہی' و 'شہری' تقسیم کے پیچھے پنجاب کی 'بازوئے شمشیر زن' کی حیثیت کا مکمل ادراک ہوتا ہے۔ انفرادی سطح پر محمد اعظم چوہدری کی کتاب **تحریک پاکستان میں پنجاب کا کردار**' سیاسی تجزیہ پر مبنی ایسی کتاب ہے جو آئین ٹالبوٹ کے 'شہری دیہی تقسیم اور نوآبادیاتی نظام کی اصطلاحات کے سیاسی فارمولے کی تصدیق کرتی ہے۔

اعتزاز حسن کی '**سندھ ساگا**' تاریخ کے طلباء کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتی ہے اگر چہ اس میں زیادہ تر لوک تاریخ و روایت کا سہارا لیا گیا ہے اور مصنف اپنے تخیل اور رزمیہ داستانوں اور ان کے ساتھ شہسواروں'

شہہ زوروں اور روایتی کرداروں کی مدد سے ایک خاص نقطہ نظر کو تاریخی تناظر میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو فنِ تاریخ نویسی کے اہم جز و غیر نوشتہ تاریخ کا انداز ہے۔

۱۹۸۸ء میں ڈیوڈ گلمارٹن کی کتاب ''**سلطنت اور اسلام**'' میں مذہبی اداروں کے سربراہوں اور علماء کی مسلم لیگ کی جدوجہد پاکستان میں کلیدی کردار پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ مختلف علاقوں میں مختلف سلسلوں کے پیروں اور مریدگان کے مروج طرز عقیدت کے سیاسی استعمال کو بنیادی مآخذ کی مدد سے واضح کیا گیا ہے۔ خاص طور سے ''دین اور دنیا'' کے اسلامی تصور کی سیاسی تناظر میں وضاحت نے اس مقالے کو مزید دلچسپ و پُر مغز بنادیا ہے اس میں آئینی جدوجہد کی سیاسی موشگافیوں کو نہایت باریک بینی اور فرقہ وارانہ سماجی سرگرمیوں کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی اہم اور مستند تحقیقی کتاب کہی جاسکتی ہے۔

انگریزوں نے پنجاب میں سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کی شروعات کیں جن میں سب سے اہم کینال کالونیز کا قیام تھا۔ انہوں نے اپنے حکومتی طریقہ کار کو بھی مقامی حالات کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی چنانچہ اُنیسویں صدی کے اختتامی ایام میں جس طرح کا پنجابی معاشرہ ظہور میں آیا، وہ دراصل انگریز حکمرانوں اور مقامی آبادی کے مابین ہونے والے تعاون سے وجود میں آیا۔

عوامی تاریخ پر تحقیق کے سراغ ہمیں مذہبی تحریکوں کے قائم کردہ کتب خانوں یا اکیڈمیوں سے شائع کتابوں سے ملتے ہیں بخاری اکیڈمی سے شائع کردہ محمد عمر فاروق کی دو کتابیں اس سلسلے کی ایک مثال ہیں جو احرار تیس کی دہائی میں مجلس احرار کے جھنڈے تلے درمیانے متوسط طبقے کے مسلمانوں کی سماجی و مذہبی بنیادوں پر چلائی جانے والی مختلف تحریکوں کی یادگار ہے۔

حنیف رامے، اطہر طاہر اور فخر زمان نے خالص پنجابی ادب و ثقافت کے حوالے سے ۸۰ اور 90 کی دہائی میں مستند کام کیا۔ لیکن مجموعی طور پر بیرونی مورخین کا حصہ زیادہ رہا۔ اعتزاز احسن کی کتاب **انڈس ساگا** پنجاب پر لکھی جانے والی کتابوں میں لوک روایتوں پر مبنی تاریخ کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اگرچہ پنجابی زبان میں برطانوی سامراج سے ٹکر لینے والے اہم پنجابی کرداروں پر تحقیق کی گئی ہے اور کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر اردو اور انگریزی زبان میں نظام لوہار، امام دین گوہادیہ، رائے احمد خان کھرل، مامند کاٹھیا، ولی داد، دوالا ماچھی، بھگت سنگھ اور مراد فتیانہ پر مستند تاریخی تحقیق، مورخین کی توجہ کی متقاضی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ائین ٹالبوٹ، مترجم طاہر کامران، **پنجاب غلامی سے آزادی تک ۱۸۵۷۔۴۷**، لاہور، تخلیقات ۱۹۹۹ء، ص ۹۔۱۹

۲۔ زاہد چودھری مرتبہ حسن جعفر زیدی، **پاکستان کی سیاسی تاریخ**، جلد ۵ **مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء**، لاہور، ادارہ مطالعہ تاریخ

۳۔ عاشق حسین بٹالوی، **اقبال کے آخری دو سال**، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۴۔ فیروز خان نون، **چشم دید**، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۴۷ء، ۸۰

۵۔ ائین ٹالبوٹ، لیکچر قائداعظم اکیڈمی ۲ مارچ، ۱۹۸۶ء

۶۔ David Gilmartin, **Empire & Islam**, London: Taurus, 1988

۷۔ Ian Talbot, GurharpalSingh(ed), **PunjabIdentity:Continuity & Change**, Delhi:Manohar:1996

۸۔ Imran Ali, **Punjab Under Imperialism**, USA:Princton, 1988

۹۔ Ian Talbot, **Khizr Tiwana**, Coventry: Curzan Press, 1996, 51-52

۱۰۔ عاشق حسین بٹالوی **اقبال کے آخری دو سال** ۴۱۔۴۲

۱۱۔ ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری **تحریک پاکستان میں پنجاب کا کردار**، کراچی، رائل بک کمپنی ۱۹۹۶ء، ۸۰

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ Zarina Salamat, **The Punjab in 1920s**, Karachi: Royal Book Company, 1997

۱۴۔ Iftikhar H.Malik, **Sikandar Hayat Khan: A Political Biography**, NIHCR, 1985, 106-7

۱۵۔ Aitazaz Ahsan, **Indus Saga & The Making of Pakistan**, Karachi, OUP, 1996

۱۶۔ Dushka H.Saiyid, **Women of British Panjab: From**

Seclusion to politics,USA,McMillan,1998.

۱۷۔ AyshaJalal,**Self&Sovereignity,**Lahore:Sang-e-Meel,2000

۱۸۔ محمد عمر فاروق، **مولانا گل شیر شہید سوانح وخدمات**، ملتان، بخاری اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

۱۹۔ ایضاً، آزادی کی انقلابی تحریک، لاہور، مکتبۂ احرار، ۲۰۰۰ء

Institute's Publications

1.	*Political Parties in Pakistan, 1947-1971,* (3 vols.), Dr. M. Rafique Afzal	Rs. Rs. Rs.	300/- 220/- 250/-
2.	The *Case for Pakistan*, Dr. M. Rafique Afzal	Rs.	150/-
3.	*London Muslim League (1908-1928): A Historical Study*, Dr. M. Yusuf Abbasi	Rs.	260/-
4.	*Making of Pakistan: The Military Perspectives*, Dr. Noor-ul-Haq	Rs.	150/-
5.	*The Frontier Policy of Delhi Sultans*, Dr. Agha Hussain Hamadani	Rs.	150/-
6.	*Newsletters in the Orient*, Dr. Abdus Salam Khurshid	Rs.	120/-
7.	*Quaid-i-Azam and Education*, Dr. S.M. Zaman (ed.)	Rs.	200/-
8.	*Islam in South Asia*, Dr. Waheed-uz-Zaman and Dr. M. Saleem Akhtar (eds.)	Rs.	450/-
9.	*Exporting Communism to India: Why Moscow Failed?* Dushka H. Sayid	Rs.	150/-
10.	*Uchchh: History and Architecture*. by Dr. Ahmad Nabil Khan.	Rs.	300/-
11.	*Pakistani Culture: A Profile*, Dr. M. Yusuf Abbasi	Rs.	300/-
12.	*A Short History of Turkish – Islamic State*. Urdu Translation.	Rs.	450/-
13.	*Pakistan: A Religio-Political Study*, Dr. Shaukat Ali	Rs.	350/-
14.	*Islam and Democracy in Pakistan*, Dr. M. Aslam Sayid	Rs.	200/-
15.	*History of Sind (British Period 1843-1936)* Vol. I, Dr. Laiq Ali Zardari	Rs.	200/-
16.	*Modern Muslim India in British Periodical Literature (1843-1936)* Vol. I. Dr. K.K. Aziz	Rs.	350/-
17.	*Jamiyyat Ulama-i-Pakistan, 1948-79*, Mujeeb Ahmad	Rs.	150/-
18.	*Perspectives on Kashmir*, Dr. (Miss) K.F. Yusuf (ed.)	Rs.	350/-
19.	*Separation ofSind from Bombay Presidency*, (2 vols.) Dr. Hamida Khuhro	Rs.	120/- 250/-
20.	*The Life and Works of Sayyid Ali Hamadani*. by Dr. Agha Hussain Hamadani.	Rs.	100/-
21.	*The Punjab Muslim Students Federation, 1937-47*, Dr. Sarfaraz Hussain Mirza	Rs.	250/-
22.	*N.W.F.P. Administration under British Rule, 1901-1919*, Dr. Lal Baha	Rs.	75/-
23.	*Thatta: Islamic Architecture*, Dr. A.H. Dani	Rs.	240/-